غالب کی ایک غزل

ڈاکٹر حامدی کشمیری
شعبۂ اردو۔ کشمیر یونیورسٹی۔

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

جوہر تیغ بر سر چشمہ دیگر معلوم
میں وہ سبزہ ہوں کہ زہر آب اگاتا ہے مجھے

مدعا محو تماشائے شکست دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

نالہ سرمایہ ایک عالم و عالم کف خاک
آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو محفل سے اٹھا دیتے تھے
مر گئے دیکھئے اب کون اٹھاتا ہے مجھے

یہ غزل غالب کے تخلیقی شعور کے مطالعے کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس میں شاعر کے چند ذہنی اور نفسیاتی واردات اور جذباتی کیفیات ایک پیچیدہ داخلی عمل سے گذر کر لفظوں کے پیکر میں ڈھل چکے ہیں۔ اعلیٰ آرٹ وقتی تاثرات کی عکاسی کرنے کے بجائے فنکار کی نفسیاتی اور لاشعوری زندگی میں رچے بسے تجربات کے تخلیقی اظہار سے تشکیل پاتا ہے۔ اور یہ تجربات اپنی تہہ داری، پیچیدگی اور سایہ در سایہ کیفیات کی بنا پر ایک پیچیدہ اور علامتی اسلوب کے متقاضی ہوتے ہیں۔ اس لئے شاعر کو عام فہم اور مروجہ زبان سے کنارہ کشی کر کے ایک نئی زبان کی تخلیق کرنا پڑتی ہے، یہ شاعر کی اپنی زبان ہے، جو امکانی شدت سے معمور ہوتی ہے۔ اور استعاراتی اور علامتی انداز رکھتی ہے، کہ تجربے کے محشرستان کو حتی الامکان سمیٹ سکے زیر نظر غزل کی زبان بھی علامتی معنویت سے مالا مال ہے، یہاں الفاظ قطعی اور استدلالی مفاہیم کے پابند نہیں ہیں۔ شاعر نے ایسے الفاظ، ترکیبیں اور علامتیں تخلیق کی ہیں جو شدت اظہار کے امکانات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اور شاعر کی تخلیقی شخصیت کے کئی اسرار و رموز سے پردہ سرکا دیتی ہیں۔ اور فاری جلوؤں کے آئینہ خانے میں حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ خفقانی، سایۂ شاخ گل، جوہر تیغ، سبزہ، زہر آب، آئینہ خانہ، کف خاک، بیضۂ قمری ——— اس چھوٹی سی غزل میں موثر اور نادر الفاظ اور علامتوں کا یہ ہجوم، غالب کے داخلی تجربات کی گہرائی اور وسعت اور ان کے تخلیقی اظہار کی قوت کی نشاندہی کرتا ہے۔

اس غزل کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ایک مربوط تخلیقی فضا ملتی ہے، جو ہمیں شاعر کی داخلی زندگی میں پہنچا دیتی ہے۔ یہاں احساس زیاں کے گہرے سائے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس پر اسرار

سایہ آلود ماحول میں شاعر خارجی دنیا سے لوٹ کر اپنی ذات کی تلاش و آگہی کیلئے بے قرار نظر آتا ہے۔ زندگی اسے بے حد عزیز ہے۔ لیکن زندگی نے اسے ہر قدم پر اذیت پہنچائی ہے۔ وہ لاکھوں اذیتیں اور روح فرسا مصائب سے دوچار ہونے کے باوجود زندہ رہا ہے۔ اسلئے کہ اس کے رگ و ریشے میں زندگی کا گرم خون رواں ہے اور ایک لمحہ وہ بھی آتا ہے۔ جب وہ اپنے ذہن کی کار آگہی سے حیات و کائنات کی بے حاصلی سے آگاہ ہوتا ہے۔ اور وہ ایک نقش فریادی بن جاتا ہے۔ کائنات کی متخالف قوتوں سے متصادم ایک حساس فرد کا کرب آگہی ـــ یہی اس غزل کا موضوع ہے،

یہ موضوع اپنی پیچیدگی اور داخلی عمق کی بنا پر بلاشبہ نفسیاتی توضیح کا متحمل ہو سکتا ہے پہلے شعر میں لفظوں کی ترتیب سے ایک ایسا المیہ کردار اُبھرتا ہے۔ جو بیک وقت دو (PARADOXICAL) خواہشوں کی شدید کشمکش میں مبتلا ہے ـــ زندگی سے محبت اور زندگی سے گریز۔ دو PARADOXICAL کیفیات، جو ایک مستقل ذہنی کشمکش کی صورت میں شاعر کے اندروں میں قیامت پیدا کرتی ہیں۔ شاعر باغ میں جاتا ہے۔ اسلئے کہ اسے باغ کی خوبصورتیوں سے عشق ہے۔ وہ حسن کا پرستار ہے اور جمالیاتی حس کی تشفی سے اخذ سکون کرتا ہے، لیکن باغ جلد ہی شاعر کے خفقانی مزاج کو پالیتا ہے۔ اور اُسے اتنا ڈراتا ہے کہ شاخ گل کا سایہ سانپ بن کر لہراتا نظر آتا ہے۔ جدید نفسیات کی رُو سے وہم (PHOBIA) کے مریض کو خارجی دُنیا کی اشیاء صورت بدل بدل کر ڈرا سکتی ہیں۔ اسلئے کہ اس کی اپنی ہی لاشعوری کیفیت اس کے ذہن پر حاوی ہو کر اس کی بشری قوت کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اور جو وہم، خوف یا ڈر اس کی لاشعوری گہرائیوں میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ وہ خارجی اشیاء میں متشکل ہو جاتا ہے۔ اور انسان خفقانی ہونے لگتا ہے۔ غالب کا یہ شعر ایک ایسے ہی حساس انسان کا المیہ ہے، جو زندگی میں بہت سے ہوشربا اور عبرتناک نظارے دیکھ چکا ہے اور جن کی کالی پرچھائیاں اس کے لاشعور میں سایہ فگن رہیں۔ اور جب کبھی وہ باغ کی فضا میں اپنی جمالیاتی حس کی تشفی کے لئے جا نکلتا ہے۔ تو وہاں بھی اس کو سکون نہیں ملتا۔ بلکہ وہ خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ غالب کو اپنی بھی زندگی میں جن حیات شکن مرحلوں سے گذرنا پڑا اور پھر دیکھتی آنکھوں جس بے دردی سے مغلیہ تہذیب کو خاک میں ملا دیا گیا۔ اس کے پیش نظر اس شعر کی تجرباتی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔

دوسرے اور تیسرے شعر میں معنی و مفہوم کی سرحدیں ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جس طرح تیغ کے جوہر کسی اور شئے کی مدد سے نہیں بلکہ زہر آب سے نکھرتے ہیں۔ اسی طرح شاعر کا وجود ایک ایسے سبزہ سے مماثل ہے جس کی نشوونما زہر آب کے بغیر ممکن نہیں۔ زہر آب کی خاصیت یہ ہے کہ وہ زمین سے اُگی ہوئی ہر شئے کو جلا کر خاک کرتی ہے لیکن ایک ایسا سبزہ ہے جو زہر آب ہی کی بدولت اُگ آتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے

جو دلیل دی ہے، کیا اسکی شاعرانہ جوازیت قابلِ قبول معلوم ہوتی ہے۔ اس شعر کو پوری غزل سے علیحدہ کرکے دیکھنے تو شعر ایک حد تک داخلی سحرکاری سے محروم نظر آتا ہے جس کی مدد سے قاری شعری تجربے پر ایمان لے آتا ہے۔ لیکن اس شعر کو پوری غزل کی ایک کڑی کے طور پر دیکھا جائے تو مطلع میں رچے ہوئے شعری تجربے کے جادوئی فضا سے گذر کر قاری ذہنی طور پر شاعر کی ہر نئی بات کو قبول کرنے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ اور وہ رمز وایما کے پیچھے حقیقتوں کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ اس شعر میں الفاظ کی ترتیب تجربے کے خلوص کا احساس دلائے بغیر نہیں رہتی۔ دوسرے مصرعے میں شعر ایک متحرک امیج کو جنم دیتا ہے جو دل و نگاہ پر چھا جاتی ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ غموں اور مصیبتوں کی شدّت شاعر کے وجود کو ختم کرنے کے بجائے اس کی سخت جانی اور توانائی میں اضافہ کرتی ہے اور ساتھ ہی اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ یہ زندگی کا ایک مثبت نظریہ ہے۔ جو غالبؔ کے یہاں سے ایک مربوط جمالیاتی رشتے کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ اس رویّے کا زیادہ موثر اور دلنشین اظہار تیسرے شعر میں ہوا ہے۔

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے
آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

یہاں شاعر نے ایلیٹ کے لفظوں میں شخصیت سے گریز کی ایک درخشندہ مثال پیش کی ہے۔ شاعر اپنے دل میں مدعا یا آرزو لیے ہوئے ہے لیکن شدائدِ زمانہ کی سنگ باری سے دل کی شکست ہو جاتی ہے۔ اور مدعا یعنی شاعر کا خواب آرزو دل سے الگ ہو کر دل کی شکست کا نظارہ کرنے میں محو ہے۔ یہ المیہ منظر جو شخصی زیاں کا مظہر ہے، شاعر پر محویت کا عالم طاری کر دیتا ہے۔ یاد رہے کہ المیہ بھی جمالیاتی عناصر رکھتے ہے۔ اس محویت کا جواز شاعر نے خود ہی دوسرے مصرعے میں فراہم کیا ہے۔ کہتا ہے کہ کوئی اجنبی قوت اسے ایک آئینہ خانہ میں لئے جا رہی ہے۔ آئینہ دل کے شکست ہونے پر آئینہ خانہ کی روشن امیج کا اُبھارنا شاعر کے تخلیقی وجدان کا ثبوت ہے۔ اس آئینہ خانہ میں کسی غیبی کشش سے وارد ہونا، اور پھر اپنے صد پارہ وجود کا مشاہدہ کرنا (مدعا کی آگہی و ربودگی کی ملی جلی کیفیات کے ساتھ) حیات سے ازلی وابستگی کے احساس کو اُجاگر کر دیتا ہے۔ اور غالبؔ کے نظریۂ حیات کے مثبت پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ غالبؔ کی شخصیت کی تعبیر ہیں مادی لذتوں اور ارضی حسن و جمال کو بہت دخل رہا ہے۔ اُن کا خون گرم تھا، وہ زندگی کی ہر ادا پر مٹتے تھے۔ وہ زندگی کا خاص مادی نظریہ رکھتے ہیں اور انتہائی حوصلہ شکن حالات میں بھی وہ زندگی سے اپنے جذباتی اور جمالیاتی رشتے کو کمزور ہونے نہیں دیتے۔ حالانکہ اس نفسیاتی کشاکش میں انہیں ایک داخلی کرب سے گذرنا پڑتا ہے۔

لیکن زندگی کا یہ مثبت نظریہ ان کے یہاں ایک مستقل قدر نہیں بلکہ لمحاتی کیفیت کی پیداوار ہے۔

Scanned with OKEN Scanner

مجموعی طور پر غالب کی روح ہمیشہ ایک پارے کی طرح تھرتھراتی رہی ہے اور وہ ازل اور ابد کے سربستہ اسرار کو پراگندہ نقاب دیکھنے کے لئے تمام عمر مضطرب رہے۔ اپنے شعور و آگہی کی بدولت، کم سے کم یہ حقیقت اُن پر منکشف ہوئی کہ عالم محض اک کفِ خاک ہے۔ اور سرمایہ عالم نالہ و فریاد ہے، شعر کو پھر پڑھیئے ؎

نالہ سرمایہ ایک عالم و عالم کفِ خاک　　آسمان بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

یہ شعر غالب کی متجسس رُوح کی ایک زخمی فریاد ہے۔ جدید اپالو دور میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ لامحدود خلا میں ستاروں اور سیاروں کے بے شمار ویران بنجر خطے معلق ہیں۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ انیسویں صدی کے وسط ہی سے غالب کے کائناتی شعور نے نظامِ شمسی کی اصلیت کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ اور انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ خلا میں ثابت یا سیارہ یہ بنجر خطے زبانِ خاموشی سے فریاد کر رہے ہیں۔ زمین بھی ایک خطۂ خاک ہے، اور لامحدود خلا میں بکھرے ہوئے خطہ ہائے خاک کے مقابلے میں عالم کو کفِ خاک قرار دینا شاعر کے کائناتی شعور کی گہرائی پر اور گیرائی پر دال ہے ـــــ عالم ایک کفِ خاک ہے اور عالم کا کل حاصل نالہ و فریاد ہے۔ کفِ خاک کا یہاں استعاراتی انداز میں استعمال ہوا ہے۔ اور یہ قمری کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ قمری نالہ کشی کے لئے مشہور ہے۔ پس اگر زمین قمری ہے۔ تو نالہ کشی اس کا حاصل اور شاعر اس صورت حال سے گھبرا کر اوپر آسمان کی سمت نظریں اُٹھاتا ہے۔ تو آسمان سکونِ قلب کی علامت بننے کے بجائے بیضۂ قمری نظر آتا ہے ـــــ بیضہ جس سے پھر ایک قمری پیدا ہونے والی ہے۔ جو فریاد و فغان کی علامت ہے۔ اس طرح زمین ہو یا آسمان، ہر سمت ایک ہی چیز اُبھرتی ہے اور وہ ہے فریاد ـــــ شاعر اس فریادی کائنات میں خود بھی اک نقش فریادی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس تجربے کا موثر اور تخلیقی اظہار اس شعر میں بھی ہوا ہے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

آخری شعر میں غالب کی نفسیاتی زندگی کی ایک اور گتھی یعنی آزاد پسندی کے رجحان پر روشنی پڑتی ہے یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب انسان پے در پے مصیبتوں اور مسلسل محرومیوں کا سامنا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ تو ایک ایسی منزل بھی آتی ہے۔ جب وہ خود اذیتی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور خود اذیتی سے ہی اخذ لذت کرتا ہے، غالب کے یہاں اکثر و بیشتر اشعار میں یہ منفی رجحان آئینہ ہو جاتا ہے جہاں تک اس شعر کا تعلق ہے۔ اس میں بھی لذتِ حسرت کے اظہار کی کوشش ملتی ہے۔

غالب کہتے ہیں کہ جب تک وہ زندہ رہے۔ اُن کا محبوب انہیں محفل سے اُٹھا دیتا تھا۔ اور ان کو شکست محرومی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ رسوائی کا یہ درد ان سے کب تک برداشت ہو سکتا۔ ؟

آخر کار اس صدمہ رسوائی کی تاب نہ لاکر وہ اُن کی محفل میں مر گئے اور اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اُن کا سنگدل محبوب کس طرح انہیں محفل سے اُٹھا دیتا ہے۔ شاعر کا حسرت و محرومی کی شدّت سے جان بحق ہونا اور صرف اس مقصد کے پیش نظر موت کو گلے لگا تا کہ محبوب اسے محفل سے اُٹھا نہیں سکے گا۔ اور وہ رسوائی سے بچے گا۔ اس کی نفسیاتی آزار پسندی کو قائم کرتا ہے۔

مفہوم کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر محبوب حسب عادت اُن کی میّت کو اُٹھا تا بھی ہے یعنی کندھا دیتا ہے۔ تو رسوا ہونے کے بجائے اس کی عزّت افزائی ہو گی اور اس طرح اس کے شکست خوردہ انا کی تسکین کا سامان ہو گا۔ تاہم یہ شعر اس کے ماقبل اشعار کی طرح معنی و مفہوم کا ابہام اور پیچیدگی نہیں رکھتا۔ حالانکہ شاعر یہاں بھی خلوص سے مفہوم کی نئی جہتوں کو دریافت کرنے کی سعی کرتا نظر آتا ہے۔ جس میں ایک حد تک کامیابی کے باوجود شعر داخلی عمق سے عاری نظر آتا ہے۔ اس شعر پر دوسرے اشعار کے خلاف روایتی اسلوب اور زبان کا اثر ہے

Scanned with OKEN Scanner